دستک
روبینہ فیصل
rubyfaisal@hotmail.com

نام تو ماؤں سے چلتا!!

دسمبر میں جب پاکستان میں اپنے سسرال کے گھر میں گئی تو فضا میں بے نام خامشی اور عجب سی اداسی تھی۔ ہر طرف ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔ سب دیور جیٹھ ان کی بیویاں بچے سب وہی تھے۔ دیواریں بھی وہی تھیں اور دروازے، چھت آسمان اور زمین سب وہی تھا۔ ڈرائنگ روم جہاں میں بیٹھی تھی وہ بھی وہی تھا۔ ہاں مگر کونے والا صوفہ خالی تھا جہاں میری ساس بیٹھتی تھیں۔ مئی میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ تو کیا ایک فرد کے جانے سے پورا گھر ہی ویرانے کا ڈھیر کا بن جاتا ہے۔ نہیں!! ایک فرد کے جانے سے گھر ویرانے میں نہیں بدلتے، ہاں البتہ "ماں" کے جانے سے گھر کھنڈر بن جاتے ہیں۔ ماں کے سب بچے، سب شاخیں بظاہر زندہ مگر مرجھا جاتی ہیں۔ ماؤں کے جانے کے بعد کون کُھل کر زندہ رہتا ہوگا؟ کھانے کی میز خالی تھی جو ماں کی موجودگی میں ہمارے لئے بھر دی جاتی تھی۔ اس کا کیا دکھ؟ دکھ تو اس کرسی کا تھا جو ماں کے وجود سے خالی تھی۔ ان سب بیٹوں کی آنکھوں کا تھا جو مجھے خالی خالی نظر آ رہی تھیں۔ ماں کے جاتے ہی اس گھر کی کائنات بدل چکی تھی۔ میرے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے آج کوئی اس گھر میں چمکتی آنکھوں سے یہ نہیں پوچھ رہا تھا کہ "بچوں نے قران شریف ختم کر لیا؟ کتنے لمبے ہو گئے؟ کلاس میں کیا گریڈ لاتے ہیں؟ تمھاری بیٹی مجھ پر ہے یا تم پر؟" کسی نے مجھے میرے شوہر کے بچپن کی باتیں نہیں بتائیں۔ ماں پہاڑے کیسے یاد کرواتی تھی؟ اور میں کہتی آنٹی اسی لئے فیصل کا حساب اتنا اچھا ہے۔ فیصل کیا کھاتے تھے؟ کتنے شرارتی تھے۔ فیصل کا بچپن کفن میں ساتھ ہی لے گئیں۔ ہمارے لئے دعا کرنے والے لب اور دل قبر میں اتر گیا۔ اب کوئی بھی میرے بچوں کی باتوں کو ان کے باپ کے بچپن کے آئینے میں رکھ رکھ کر نہیں دیکھ رہا۔ جاتے ہوئے میری بند مٹھی کھول کر کسی نے اس میں بچوں کی اور میری شاپنگ کے لئے پیسے نہیں رکھے۔ کسی نے غمگین آنکھوں سے، حسرت سے نہیں پوچھا بچے کب ملنے کب آئیں گے؟ ماں گئی تو سب ساتھ لے گئی۔ اللہ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ماؤں کا دن جب منایا جاتا ہے تو پھول اور تحفے دینا تو ایک رسم بن گیا ہے۔ اگر یہ دن منانا ہی ہے تو ماؤں کی ان قربانیوں، محبتوں اور دعاؤں کو یاد کرنا چاہیئے جو ہماری زندگی کے قدم قدم پر ہمارا ساتھ دیتے ہیں۔ جن کے بغیر شائد پھول شاخوں پر کھل تو جائیں مگر جلد ہی مرجھا جائیں۔ میری ماں صبر، حوصلے اور جدوجہد کا نام ہے۔ ایکدن ایک تحفہ دے کر ہم ان ساری کوششوں کو بے معنی اور چھوٹا کر دیں گے، اگر ہم اس دن بیٹھ کر یہ یاد نہ کریں کہ ماں کا سفر کتنا طویل اور کھٹن تھا۔ جس کے نتیجے میں ہماری زندگیاں آسان ہوئیں اور ہم ماں کا چہرہ بن سکے یا نہیں؟ ماؤں کو شائد بدلے میں کچھ چاہیئے نہیں ہوتا۔ میں ماں بنی تو سمجھ آئی کہ ماں کو جاگتی راتوں، ہزار قربانیوں اور لاکھ تکلیفوں کے بعد بچوں سے صرف ان کی کامیابی اور چہرے پر خوشی چاہیئے ہوتی ہے مادی بدلہ دینے والے بہت خوش قسمت مگر کچھ میرے جیسے جو صرف چہرے پر مسکراہٹ سجا کر ہی ماؤں کو خوشی دے دیتے ہیں۔ میں اس معاملے میں بہت خوش قسمت ہوں میں نے زندگی میں اپنی امی کو بہت

دفعہ ہنسایا ہے۔میری باتوں پر جب وہ دل کھول کر ہنستی ہیں تو میرے دل کو تسلی ہو جاتی ہے بہت نہیں تو اتنا تو کر ہی دیا میں نے۔میں اپنی امی کے سکھ کے لئے شائد بہت کچھ نہ کر سکی مگر تسلی یہ ہے کہ کبھی دکھ بھی نہیں دیا۔میری ذات سے میری ماں کو کبھی تکلیف نہیں پہنچی۔ماؤں کا دن منانے والے یہ سوال اپنے آپ سے پوچھ لیں۔ماؤں کو خوش کرنے کے لئے کسی لمبے چوڑے سیمینار کی ضرورت نہیں۔

ماؤں کے عکس اور روپ بچوں میں چلتے ہیں۔فیصل کو راتوں کو بستر پر پہاڑے یاد کرواتی ماں خود تو چلی گئی مگر فیصل کو maths genius بنا گئی۔ماں کا عکس کب مٹے گا۔وہ اس رنگ کے ساتھ میری بیٹی میں زندہ ہے۔ٹیچر پوچھتے ہیں بچوں کا maths اتنا اچھا کیسے۔میرے بچے فیصل کی امی کا عکس اور میری امی کا عکس، جو آج بھی بچوں کو دیکھتے ہی دو جمع دو پڑھانا شروع ہو جاتی ہیں۔لوگ کہتے ہیں خاندان کا نام لڑکوں سے چلتا ہے۔لوگ یہ نہیں سمجھتے نام کا کیا ہے کردار اور شخصیت بچوں کی ماں سے چلتی ہے۔اور اصل میں کردار اور شخصیت ہی تو نام ہے۔لڑکے پیدا کر کے لوگ نسل بچاتے۔ناسمجھ ہیں، نسلیں تو لڑکیاں (کل کی مائیں) بچا رہی ہیں۔

میری امی نے ساری عمر جدوجہد کی۔صبح فجر کی نماز سے ان کے دن کا آغاز ہوتا۔ہمیں ہاتھ سے روٹی پکا کر دینے اور روٹی کمانے تک سب کام اپنے ہاتھوں سے کرتیں۔ساری عمر بچوں کو پڑھایا۔اور سر اٹھا کر زندگی گذاری۔عورت کی آزادی کا صحیح مطلب میں نے اپنی امی سے سیکھا۔جو باعزت طریقے سے خودمختار ہو کر جینے میں ہے۔عید پر ہمیں تیار کر کے عید کی خوشیوں کا لطف اٹھانے باہر بھیج دیتیں اور خود گھر کے کپڑوں میں سارا سارا دن کچن میں ہمارے لئے کھانے بناتی رہتیں۔اپنے لئے کپڑے نہ سلواتیں، شائد ایک یا دو سوٹ ہونگے انہی میں سکول چلاتی رہیں۔انتہائی خوبصورت ہونے کے باوجود نہ سجنے کا شوق نہ سنورنے کا۔اب بتاتی ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ امی کو بھی سب شوق تھے مگر بچوں کے ہوتے انہیں سب بھول گئے تھے۔میں جب تک ماں نہیں بنی تھی مجھے ماں کا کوئی رنگ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

ایسی ماں جس نے ساری زندگی بناؤ سنگھار کیا، نہ سیر و تفریح اور نہ دوستیاں کیں اور ہمارے بڑے ہونے تک نہ رشتوں داروں کو وقت دیا۔اپنا فوکس بچوں کی صحت اور تعلیم رکھا۔اور آج ان کوششوں کے نتیجے میں ہم انتہائی اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔پڑھا کر صرف فرض پورا نہیں کیا، شادیوں کے بعد بھی کسی کو مسئلہ ہوا تو اسے سمیٹا، ہاتھ پکڑا اور پھر سے اٹھا دیا۔مگر ایسی ماؤں کی آزمائش شائد بہت لمبی ہوتی ہے۔2013 کے دسمبر میں امی نے اپنی بیٹی فوزیہ کو کھو دیا۔میری بھانجیوں سارہ، ثنا نے اپنی ماں کو کھو دیا۔وہ میری بہن تھی۔میری امی کا ایک روپ تھی۔ماؤں کے جتنے بچے ہیں ہر بچہ اپنی ماں کا ایک روپ ہوتا ہے، ایک پہلو۔وہ روپ بچھڑ گیا۔فوزیہ جدوجہد اور ہمت کا ایک روپ تھی۔برین ٹیومر کے ساتھ 13 سال تک لڑتی رہی۔آخری دنوں میں جب نہ جسم ہلا سکتی تھی اور نہ بول سکتی تو آنکھوں میں ہمت پھر بھی کم نہیں تھی۔امی کی تکلیف بھری زندگی کا ابھی وقت ختم نہیں ہوا تھا۔چھوٹے بچے کی طرح فوزی کو پھر سے پالنے لگ گئیں۔

بستر پر لیٹے لیٹے فوزی نے بچیوں کی تعلیم پر ایسے ہی توجہ رکھی جیسے صحت مند ہوتی تو رکھتی۔سارہ کا میڈیکل میں پہلا دن تھا اور اسی دن فوزی بیڈ سے ہل بھی نہیں سکی۔جدوجہد کا سفر سارہ تک پہنچ چکا تھا۔ہمت کی کہانی جو امی سے شروع ہوئی، فوزیہ نے اسے جاری رکھا اور پھر سارہ نے اپنے کندھوں پر یہ بوجھ اٹھا لیا۔شرافت اور ہمت کی مثال بن گئی۔بیمار ماں کو بھی دیکھتی اور میڈیکل کے مشکل مراحل بھی طے کرتی گئی۔آج امی اپنی بیٹی کھو چکی ہیں لیکن سارہ وہ وراثت لے کر چل رہی ہے جو امی کی ہے۔ہمت، شرافت اور حوصلے کی۔وراثت کا بھاری پتھر

تو ماؤں کے سینوں سے منتقل ہوتا۔ بات خون کی ہوتی تو مان لیتی یہاں تو اس پسینے کی ہے جو ماؤں کے وجود سے پھوٹتا اور بچوں کو سینچتا ہے۔ 2014 کے mother's day پر سارہ کی ماں اس کے ساتھ نہیں ہوگی۔ دعا کرنے والے ہاتھ اور حوصلہ دینے والی آنکھیں منوں مٹی تلے جا چھپی ہیں مگر سارہ کے اندر اس کی ماں بیٹھی ہے وہ کوئی نہیں نکال سکتا۔ بیٹی ماں کا عکس اور اسکی ماں اپنی ماں کا عکس ہوتی ہے۔ کون کہتا ہے نسل لڑکوں سے چلتی ہے۔